مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

از

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی رحمہ اللہ

ماہنامہ دار العلوم دیوبند

دسمبر 1953ء

صلی اللہ علیہ وسلم

مسئلہ حیات النبیؐ

دیوبندی مکتبِ خیال کی روشنی میں

(مولٰنا اخلاق حسین قاسمی الدہلوی)

اِس عقیدہ پر تو ساری اُمت کا اتفاق ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم "حیات" ہیں لیکن وہ حیات کیسی ہے۔؟ برزخی (رُوحانی) یا دنیوی (جسمانی) ــــ اس کے جواب میں علماء کے دو مشہور مسلک سامنے آتے ہیں:-

ایک طبقہ جسمانی زندگی کا قائل ہے اور کچھ حضرات صرف رُوحانی اور برزخی زندگی کے۔

پہلا طبقہ کہتا ہے:-

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں اسی طرح حیات ہیں جس طرح آپ جسم مُبارک کے ساتھ دُنیا میں حیات تھے۔

دوسرا طبقہ کہتا ہے:-

آپ کی حیات برزخی ہے، جیسی کہ شہداء فی سبیل اللہ کی، لیکن نہ بالکل ان جیسی، بلکہ اُن سے بہت ممتاز اور افضل۔

پہلے طبقہ کی ترجمانی حضرت شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں اس طرح کی ہے:-

جسمانی زندگی کے دلائل:-

پہلی دلیل انبیاء علیہم السلام کے اجسام قبروں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ زمین کے لئے ممنوع ہے کہ وہ انھیں گلائے یا سڑائے۔

ان اللہ حرّم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء[1]	"اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام کو کھائے"

قبروں میں جسم اِسی لئے محفوظ ہیں کہ اُن کے ساتھ روحوں کا تعلق قایم ہے، اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

حضرت قتادہ (مشہور تابعی) نے جسموں کی حفاظت کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے:-

بلغنی ان الارض لاتسلط علی جسد الذی لم یعمل خطیئۃً[2]	"مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ زمین اس جسم پر مسلط نہیں کی جاتی"

حضرت قتادہ نے حیات انبیاء کی اصل وجہ کی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی جو جسم گناہوں کی آلودگی سے پاک ہیں وہ جسمانی عالم سے جُدا ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اور زمین اُن کا ایک رونگٹا بھی خراب نہیں کر سکتی۔

یہ مسلّم ہے کہ خطاؤں سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہیں، اس لئے اُن ہی کے اجسام قبروں میں محفوظ ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر قبروں میں جسموں کی حفاظت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جسمانی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں تو پھر انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اُن لوگوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جن کے جسم قبروں میں محفوظ رہتے ہیں۔ مثلاً خود سرورِ عالم نے قرآن کے حافظوں کے متعلق فرمایا:-

اذا مات حامل القرآن اوحی اللہ تعالیٰ الی الارض	"جب حامل قرآن مرتا ہے تو خدا تعالیٰ زمین کو حکم دیتا ہے کہ وہ اُس کا گوشت

[1] بحوالہ النوادر ص ۵۱۹ بحوالہ ابوداؤد ابن ماجہ حاکم ۱۲۔

[2] تفسیر مظہری بحوالہ طبرانی عن جابرؓ

ان لاتاکل لحمهٗ فتقول الارض یارب کیف اکل لحمهٗ وکلامك فی جوفه؟[1]

(تفسیر مظہری)

نہ کھائے تو وہ کہتی ہے کہ اے پروردگار میں اُس کا گوشت کیسے کھا سکتی ہوں جب تیرا کلام اس کے سینے میں محفوظ ہے۔"

اِسی طرح اُحد کے شہیدوں کے متعلق یہ ثابت ہے کہ اُن کی لاشیں اپنے مدفنوں میں محفوظ نکلیں۔ جب واقعہ اُحد کے چالیس[3] سال بعد حضرت معاویہ کے عہد میں میدانِ اُحد میں نہر نکالنے کے لئے زمین کھودی گئی تو حضرت عمرو ابن جموح اور حضرت عبداللہ ابن جبیر انصاری کی لاشیں بالکل تروتازہ پائی گئیں اور حضرت حمزہ کی لاش پر کدال لگنے سے اُن کے پیر میں سے خُون نکلا۔[3]

یہ واقعات بھی صحیح ہیں اور سرورِ عالم کا ارشاد بھی درست ہے لیکن یہ محض جزوی فضیلتیں ہیں جو اظہارِ کرامت کے طور پر خدا تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا فرما دیتا ہے، یہ کوئی عام کلیہ نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر حافظِ قرآن کا جسم قبر میں لازمی طور پر محفوظ رہتا ہے۔ یا بلا استثناء ہر شہید کے جسم کو قبر میں وہ خاص حفاظت میسر ہوتی ہے جس کا اعلان انبیاءِ کرام کے متعلق کیا گیا ہے۔

جزوی فضیلت کے خاص خاص واقعات میں اور عام کلیہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا جسمِ پاک قبر میں محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا ——— جس یقین کے ساتھ ہم اس حقیقت کا دعویٰ کرتے ہیں کسی نیک سے نیک انسان کے بارے میں بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

سرورِ عالم کے جسمِ اطہر کا قبر میں محفوظ ہونا ایک تاریخی حقیقت کے طور پر بھی ثابت ہو چکا ہے، اُس واقعہ سے جو پانچسو ستاون ہجری میں سلطان نورالدین زنگی کے ساتھ پیش آیا، اور جسے مدینہ منورہ کے تمام مؤرخین جمال مطری، علامہ مجدالدین فیروز آبادی وغیرہ نے اپنی تاریخوں میں بیان کیا ہے۔[3]

دوسری دلیل[2]

عام طور پر موت کے بعد انسان کے جسم میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے، چہرے پر وحشت برسنے لگتی ہے ہاتھ، پیر اکڑ جاتے ہیں، ناک کا بانسا بھر جاتا ہے۔ لیکن سرورِ عالم کا جسدِ اطہر اس قسم کے تمام تغیرات سے محفوظ رہا، وصال کے بعد کسی نے آپ کے روئے انور میں کوئی ادنیٰ فرق بھی محسوس نہیں کیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں:۔

غُسل دیتے وقت میں نے حضورؐ کے جسم میں وہ علامات تلاش کیں جو مرنے کے بعد انسان میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ لیکن باوجود تلاش کے میں نے کوئی علامت نہیں پائی۔

اسی پر حضرت علیؓ نے فرمایا:۔

بابی انت وامی ما اطیبك حیًا ومیتًا[4]

"میرے ماں باپ آپ پر قربان! کس قدر پاکیزہ ہے آپ زندگی میں بھی اور موت میں بھی"

ہر دو میں علماءِ اُمت نے اِس تاریخی حقیقت کی پُوری قوت سے حفاظت کی۔ اگر کسی نے اس کے خلاف کچھ کہا تو اُس کے ایمان میں کلام ہونے لگا۔

وکیع ابن جراح نے اسماعیل ابن ابی خالد سے یہ کہا کہ وفات کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیٹ پھُول گیا تھا، اُنگلی مڑ گئی تھی، اور ناخن سبز ہو گئے تھے، کیوں کہ آپ پیر کے دن کے وفات پائے ہوئے بُدھ کی رات کو دفن کئے گئے تھے ———

اور اس کی حکمت یہ بیان کی ———

اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کی جماعت میں سے جن لوگوں نے آپ کی وفات کا انکار کیا تھا وہ ان علامات کو دیکھ کر آپ کی وفات کا یقین کر لیں۔

وکیع کی یہ باتیں جب مکے کے والی حاکم عثمان کے پاس پہنچائی گئیں تو حاکم نے وکیع کو حرم سے باہر پھانسی دینے کا حکم دے دیا۔ سفیان ابن ابن عیینہ کو والی مکہ کا یہ فیصلہ معلوم ہوا، انہوں نے اگر وکیع کے لئے سفارش کی، والی مکہ نے ان کی سفارش قبول کر لی اور وکیع مکہ سے مدینہ طیبہ چلے گئے۔[5]

سرورِ عالم کے جسم میں تغیر نمودار ہونے کی روایات کو ابن سعد نے

---

[1] و [2] تفسیر مظہری ١٢ +

[3] مدارج النبوۃ صفحہ ٥٧٠ ج ٢ - +

[4] ابن ماجہ کتاب الجنائز ١٢ - [5] نسیم الریاض شرح شفاء صفحہ ٣٩٠ ج ١ +

طبقات میں نقل کیا ہے، اس کے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے :-

" ابن سعد عرصہ سے مفقود تھی، اب اُسے یورپ والوں نے چھپوایا ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اصل نسخہ کے مطابق ہے یا اس میں اضافہ کر دیا گیا ہے، اس میں امہات المومنین اور حضور کی وفات سے متعلق بعض ایسی روایات موجود ہیں جن کا دوسری اسلامی تصنیفات میں باوجود تلاش کے کہیں پتہ نہ چلا۔ پھر ابن سعد خود بھی کوئی ایسی کتاب نہیں جس کی تمام روایات قابلِ قبول ہوں، لہٰذا اس کی وہی باتیں قابلِ اعتبار ہو سکتی ہیں جو تفسیر و حدیث کی دوسری متداول کتابوں میں موجود ہیں، ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں جو قاعدہ لکھا ہے اس کا حاصل یہی ہے "

تیسری دلیل
چند احادیث

(۱) پہلی حدیث :-

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون[1] " انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں "

(۲) دوسری حدیث :-

خدا تعالےٰ نے کچھ فرشتے اس کام کے لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ زمین پر گشت کریں اور میری اُمت کا درود و سلام مجھ تک پہنچائیں[2]

(۳) تیسری حدیث :-

امام عبدالحق جو کبار محدثین میں سے ہیں انہوں نے احکام صغریٰ میں حضرت ابن عباس کی ایک صحیح روایت نقل کی ہے، حضور نے فرمایا :-

" جو شخص اپنے اس مسلمان بھائی کی قبر پر جاتا ہے جس مسلمان کو وہ جانتا تھا، اور جا کر سلام کرتا ہے تو وہ صاحبِ قبر اسے جواب دیتا ہے "

پس جب عام مسلمانوں کے بارے میں یہ ثابت ہے تو حضورؐ تو ہر حال میں افضل و اکمل ہیں[3]

(۴) چوتھی حدیث :-

حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں، حضور نے ارشاد فرمایا :-

" اگر فرشتے تمہارے اچھے اعمال مجھ تک پہنچاتے ہیں تو میں خوش ہوتا ہوں اور اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور اگر بُرے اعمال پہنچاتے ہیں تو اُن کے لئے دُعائے مغفرت کرتا ہوں "

اِن احادیث کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں :-

" اِن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سرورِ عالم کو اپنی قبر شریف میں حیاتِ حسی حاصل ہے، نہ صرف حیاتِ معنوی جیسی کہ شہیدوں کو حاصل ہوتی ہے "

دوسرے طبقہ میں سے علامہ علاؤالدین قونوی جو علماء شافعیہ میں ایک بڑے صاحب تصوّف بزرگ ہیں، حضور کی زندگی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کے پاس جنت المأویٰ میں حیاتِ متعارف سے بہتر حیات کے ساتھ قیام گیر ہیں، اور یہ حالت قبر میں مقیم رہنے کی حالت سے کہیں زیادہ افضل و بہتر ہے " اگرچہ حضور نے فرمایا ہے کہ " مومن کی قبر حدِ نگاہ تک وسیع ہوتی ہے " ــــــ پھر انبیاء علیہم السلام کی قبروں کا کیا کہنا ــــــ لیکن اس کے باوجود آپ کا جنت المأویٰ میں ہونا سب سے افضل و اعلیٰ حالت ہے۔ چنانچہ خود حضورؐ نے فرمایا ہے کہ میں اپنے پروردگار کے پاس تم سے بہتر حالت میں ہونگا کیوں کہ مجھے میرا رب تین روز کے بعد قبر میں نہیں چھوڑے گا "

شاہ صاحب علامہ کے " عقیدہ " پر لکھتے ہیں :-

" قبر شریف کے قیام " اور " پروردگار کے پاس قیام " ان دونوں باتوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے، کیونکہ قبر کی زندگی کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خدا تعالےٰ نے حضور کو اتنی قدرت عطا فرمائی ہے کہ آپ جہاں چاہیں جائیں ــــــ بعینہٖ یا بمثالہٖ ــــــ لیکن ہر حال میں آپ کو اپنی قبر شریف کے ساتھ ایک خصوصی نسبت قائم رہتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک مومن کی قبر کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کی قبر جنت کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا ہے تو پھر اس لحاظ سے نبی کی قبر تو جنت کا عمدہ ترین ٹکڑا ہونا چاہیئے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالےٰ نے آپ کی قبر مبارک اور زمین و آسمان اور جنت و عرش کے درمیان سے تمام پردے اُٹھا دئے

---

[1] بحوالہ مسند ابو یعلیٰ عن انس [2] نسائی عن ابن مسعود [3] مدارج النبوۃ ۱۲۰

ہیں اور آپ کو اتنا تصرّف اور نفوذ حاصل ہو گیا ہے کہ آپ بلا انتقال مکانی جہاں چاہیں تشریف لے جائیں۔

یہ بات اس عالم کے لئے ممکن ہے، کیونکہ احوال دُنیا محدود ہیں اور احوال برزخ و آخرت غیر محدود ہیں۔

قبر شریف کے متعلق علامہ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں:-

"وہ کونسی جنت ہے جو حضور کی قبر مبارک سے افضل ہوگی، آپ کی قبر مبارک جنت ہی سے نہیں بلکہ تمام مقاموں سے اعلیٰ وارفع ہے اگر یوں کہا جائے کہ اس قطعہ مبارکہ کا جو حصّہ حضور کے جسم اقدس سے ملحق ہے وہ عرش سے بھی افضل ہے تو اس میں بھی کسی مومن کو توقف نہیں ہوسکتا۔"[1]

ان دونوں طبقوں کی تشریحات آپ کے سامنے پیش کر دی گئیں، اب اس مسئلہ پر دیوبندی مکتبِ خیال کی وہ تشریح ملاحظہ کیجئے جو متقدمین کے سارے اختلافات کو ختم کرکے تمام صورتوں میں بہترین تطبیق پیدا کرتی ہے —— نہ نصوص میں کوئی اشکال باقی رہتا ہے اور نہ عقلاً کوئی اُلجھاؤ سامنے آتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی اپنے ایک مکتوب میں زیارت قبر نبوی کے متعلق حافظ ابن تیمیہ کے مسلک کو مرجوح قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

"مدینہ منورہ کی حاضری محض جناب سرورِ کائنات کی زیارت اور آپ کے توسل کی غرض سے ہونی چاہئے۔

آپ کی حیات نہ صرف رُوحانی ہے جو کہ عام مومنین اور شہدا کو حاصل ہے بلکہ جسمانی بھی ہے اور از قبیل حیاتِ دنیوی بلکہ بہت سے وجوہ سے اس سے قوی تر ہے، آپ سے توسل نہ صرف وجودِ ظاہری کے زمانہ میں کیا جاتا تھا، بلکہ اس برزخی وجود میں بھی کیا جانا چاہئے۔

محبوب حقیقی تک وصال اور اُس کی رضا صرف آپ ہی کے ذریعہ اور وسیلہ سے ہو سکتی ہے۔"[2]

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند جو ہمارے اکابر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے علوم و معارف کے بہترین شارح ہیں، اس مسئلہ پر تحریر فرماتے ہیں:-

"حضور کی حیات برزخی ہے مگر اس قدر قوی ہے کہ بلحاظ آثار دنیوی بھی ہے یعنی دُنیا میں جب تک حضور تشریف رکھتے تھے حیات ناسوتی بھی تھی مگر اسی آن وہ برزخی بھی تھی اور برزخ ایک درمیانی عالم ہے وہ حیات اُخروی بھی تھی۔ چنانچہ اسی حیات ناسوتی اور اسی جسم اطہر کے ساتھ سماوات اور ارضین طے کرنا عرش تک جا پہونچنا، مسجد اقصےٰ میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کرنا، ظاہر ہے کہ ترکِ جسد کے ساتھ نہ تھا، پس حیات تو اسی جسدانی عالم کی تھی لیکن جسد اطہر خود اتنا لطیف تھا کہ وہ اسی آن عالم برزخ بلکہ عالم غیب کے معاملات اور مشاہدات کی طاقت بھی لئے ہوئے تھا، پس اگر وہی جسدِ اطہر جو دُنیا میں ہم رنگ رُوح تھا بعد وفات اگر عالم برزخ میں پہنچکر بحق دُنیا، اسی طرح زندہ ہے جیسے معراج کے وقت سارے غیبی عالموں میں پہنچکر اپنی جسدانی ہستی کو بحق دُنیا سنبھالے ہوئے رہا اور دنیوی حقوق، اُس کے بدستور قائم رہے تو اس میں تعجب یوں نہیں کہ یہ معاملہ تو اس جسد پاک کو بوقتِ معراج پہلے بھی پیش آچکا تھا، فرق اتنا ہوا کہ شب معراج میں جسم اطہر کے ساتھ رُوح پر فتوح کا تعلق حسّی طور پر اس طرح قائم تھا کہ اگر ہم ہوتے تو ہم بھی احساس کر سکتے تھے اور بعد وفات اس طرح حسّی طور پر قائم نہیں رہا کہ ہمیں بھی نظر آئے، سو یہ قصور ہمارا ہوا، نہ کہ تعلق رُوح و جسد کی نوعیت کا، یہی وجہ ہے کہ بعد وفات حضور کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی جنازہ میں کلام فرمایا، کہ:-

"بیرادیس وما بیرادیس، سوف تعلمون" اور قبر میں کلام فرمایا جسکو بعض صحابہ نے سُنا، یہ تو وفات کے بعد فوری بات تھی کہ رُوح نے جسم کو کلیۃً نہیں چھوڑا۔ لیکن بعد میں تا حشر بھی رُوح کا وہی تعلق بدن سے قائم رہے گا، جیسا کہ بنص حدیث اجساد انبیاء کا مٹی پر حرام ہونا ثابت ہے۔ اگر ان ابدان میں کوئی رُوح نہیں ہے تو انھیں گل جانا چاہئے۔ پھر حیات کا یہ اثر عالم برزخ میں ہے، عالم دُنیا میں یہ ہے کہ اُن کے اموال میں میراث جاری نہیں ہوتی، اُن کی ازواج میں بیوگی نہیں آتی، اُن کے نکاح حرام ہوتے ہیں۔ نہ صرف عظمتِ انبیاء کی وجہ سے بلکہ حقیقۃً حیات کی وجہ سے کہ وہ بیوہ ہی نہیں ہیں۔

[1] مدارج النبوة صـ ۲۷ ج ۲ ، [2] مکتوبات شیخ الاسلام صـ ۱۳۱

پس انبیاء کی یہ برزخی حیات جسمانی از قبیل حیات دنیوی بھی ہے کہ اجسام میں حس و حرکت بھی ہے، قبروں میں عبادت بھی ہے، کلام بھی ہے، اُمت کی طرف توجہ بھی ہے، تصرف بھی ہے، بقاء اجسام بھی ہے، اور حیاتِ اجسام بھی ہے، پھر یہی حیات از قبیل حیات برزخی بھی ہے کہ نگاہوں سے اوجھل ہیں، اُن کی آواز ان کانوں میں نہیں آتی، اور کلام ان حسی کانوں میں نہیں پڑتا۔ نیز توجہ الی الامت اور رخ کا پھیرنا ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ سو اس میں ہماری کمزوری، اور ضعفِ قویٰ کو دخل ہے نہ کہ ان آثار کے موجود نہ ہونے کا، یا قابلِ وجود ہونے کا۔

بالفاظ مختصر دونوں حیاتیں اس طرح جمع ہیں کہ حیات برزخی اصل ہے اور حیات دنیوی اس کے تابع، یعنی وہ عیناً موجود ہے یہ آثاراً موجود ہے، اس طرح دونوں حیاتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ مگر نہ استعارۃً بلکہ حقیقتاً۔

پہلی حیات یعنی دنیوی زندگی میں عین نبوی اس جہاں میں تھا اور تمثل اس جہاں میں، (اور عکس یا تمثال عین شئی ہوتا ہے) اور اس دوسری حیات میں عین نبوی اس جہاں میں ہے اور تمثل اس جہان میں جیسے وہاں کا تمثل ہر کس و ناکس نہیں دیکھ سکتا، ایسے ہی اب یہاں کا تمثل ہر کس و ناکس نہیں دیکھ سکتا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ عکس شے اور شئی میں عینیت کا علاقہ ہوتا ہے، اگر تباین کا ہو تو مثال یا صورت دیکھ کر کبھی بھی عین کا تعارف نہ ہوا کرے، اس لئے جس جہاں میں جب بھی وجود ہو دوسرا وجود اس کا عین ہے اس لئے حضور اس برزخی جہاں میں رہ کر اگر اس جہاں میں متجلی اور منعکس ہیں تو بعینہٖ ہیں نہ کہ کسی استعارہ یا تشبیہ کے طور پر۔ "واللہ اعلم"

ایک اشکال اور اس کا حل

مسئلہ حیات النبی ﷺ پر ایک مشہور اشکال ہے جو حسب ذیل حدیث کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے، ضروری ہے کہ بحث کی تکمیل کے لئے اسکی بھی وضاحت کر دی جائے۔

حدیث یہ ہے:-

ما من احد یسلم علیّ الا رد اللہ علیّ روحی حتی ارد علیہ السلام۔

"جب مجھ پر کوئی سلام بھیجتا ہے، تو خدا تعالےٰ میری رُوح کو میری طرف لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں"

اس حدیث نے یہ سوال پیدا کر دیا کہ کیا حضور کی رُوح آپ کے جسدِ پاک سے جدا رہتی ہے اور اس وجہ سے سلام کا جواب دینے کیلئے آپکے تن پاک میں اُس کا لوٹانا ضروری ہوتا ہے، پھر اگر یہ بات ہے تو حیات جسمانی کے کیا معنی؟ ——

اس اشکال کا جواب ایک تو حضرت شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے دیا ہے، فرماتے ہیں:-

"سرورِ عالم کی رُوح ہمیشہ مشاہدہ الٰہی میں مستغرق رہتی ہے، جب کوئی مسلمان آپ پر درود بھیجتا ہے تو آپ کی رُوح کو افاقہ دے کر اس عالم کی طرف توجہ کرنے کی فرصت دیدی جاتی ہے تاکہ آپ اُس کا جواب دے سکیں"

حضرت شاہ صاحب کے جواب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضور کو مشاہدہ میں استغراق کا موقعہ ہی نہیں ملتا، کیوں کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جس میں آپ پر درود و سلام نہ بھیجا جاتا ہو تو پھر آپ کی توجہ کا اس عالم کی طرف ہر آن لگا رہنا ضروری ہوا۔

اس اشکال کی وضاحت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے اپنے ایک مکتوب میں اس طرح فرمائی ہے:-

"اگر لفظ "الی روحی" فرمایا گیا ہوتا تو آپ کا شبہ وارد ہو سکتا ہے، الی اور علی کے فرق سے آپ نے ذہول فرمایا۔ علی استعلاء کے لئے آتا ہے اور الی نہایت طرف کے لئے، اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ و سلام سے پہلے رُوح کا استعلاء نہ تھا، نہ یہ کہ وہ جسم اطہر سے بالکل خارج ہو گئی تھی، اور اب اس کو جسم اطہر کی طرف لوٹایا گیا ہے۔

چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مدارج قرب و معرفت میں ہر وقت ترقی پذیر ہیں اس لئے "توجہ الی اللہ" کا انہماک اور استغراق دوسری

جانب کی توجہ کو کمزور کر دیتا ہے۔ چنانچہ اہلِ استغراق کی حالتیں روزانہ مشاہدہ ہوتی ہیں، مگر جب رسول اللہ صلعم کو رحمۃ للعالمین بنایا گیا ہے اِس لئے بارگاہِ الوہیت سے درود بھیجنے والے پر رحمتیں نازل فرمانے کے لئے متعدد مزایا میں ایک مزیت یہ بھی عطا فرمائی گئی کہ خود سرورِ کائنات کو اس استغراق سے منقطع کر کے درود بھیجنے والے کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے اور آپ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کے لئے دعا فرماتے ہیں۔" (مکتوبات شیخ الاسلام ۲۴۳)

جو اشکال حضرت شاہ صاحب کے جواب پر وارد ہوتا ہے وہی اشکال اس جواب پر بھی وارد ہو سکتا ہے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں اِس گتھی کو سُلجھایا ہے، لکھتے ہیں:۔

"اس کی گرہ یوں کھلتی ہو کہ وہاں آسمان پر جو موسیٰ علیہ السلام کو آپ نے دیکھا تو وہ انکی رُوح کا مقام و مستقر تھا اور قبر اُن کے جسم کا، جہاں وہ قیامت میں رُوحوں کے لوٹانے کے وقت تک رہے گا، اسی طرح آپ نے اُن کو ان کی قبر میں نماز پڑھتے بھی دیکھا، جس طرح وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بلند تر مقام یعنی رفیق اعلیٰ میں بھی قرار گیر ہیں اور جسم مُبارک قبر شریف میں بھی موجود ہے، جب درود و سلام بھیجنے والا آپ پر سلام بھیجتا ہے تو خدا تعالےٰ آپ کی رُوح کو واپس کرتا ہے تا آنکہ آپ جواب دیتے ہیں، حالانکہ مقام رفیق اعلیٰ سے آپ علیحدہ نہیں ہوئے، جو موٹی طبیعت کا آدمی اس مطلب کو نہ سمجھ سکے اُسکو چاہیئے کہ آفتاب کی کہ اس کی دوری اور بلندی کے باوجود اس کا تعلق زمین سے قائم ہے اور اُس کے اندر وہ اثر ڈالتا ہے، اور نباتات اور حیوانات کی زندگی میں اس کو دخل ہے۔ پھر رُوح کا مرتبہ تو اِس سے بدرجہا زیادہ ہے کیونکہ رُوح کا معاملہ اور ہے اور جسم کا معاملہ اور ہے، دیکھو آگ اپنی جگہ رہتی ہے اور اس کی گرمی دور کے جسم پر اثر انداز ہوتی ہے رُوح اور بدن کا باہمی تعلق تو اس سے بھی زیادہ قوی اور کامل ہے اس لئے کہ رُوح آگ سے زیادہ اعلیٰ اور لطیف ہے۔"

فقل للعیون الرمد ایاک ان تری
سنا الشمس فاستغشی ظلام اللیالیا

"گرد آلود آنکھوں سے کہہ دو کہ وہ آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں کیونکہ انھیں راتوں کی تاریکی نے ڈھانپ لیا"

(زاد المعاد ۱۲/۲ مصری)

اب وہ جواب ملاحظہ کیجئے جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اپنی مشہور کتاب "آب حیات" میں دیا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اُمت کی طرف توجہ فرمانے سے حضور کے استغراق میں قطعاً فرق نہیں پڑتا، فرماتے ہیں:۔

"رُوح پر فتوح نبوی صلعم جب منبع اور اصل ارواح باقیہ خصوصاً ارواح مومنین امت ٹھیری تو جونسا اُمتی آپ پر سلام عرض کرے گا اُس کی طرف کا شعبہ لوٹے گا، ارتداد جملہ شعب لازم نہیں، اور ظاہر ہے کہ اس شعبہ کا ارتداد باعث اطلاع سلام تو ہوگا پر موجب زوال استغراق مطلق نہ ہوگا، آخر شعب غیر متناہی اور ہیں۔" (آب حیات صـ ۲۳۳)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اس عبارت کی تشریح میرے ایک استفسار پر اپنے مکتوب گرامی میں اس طرح فرماتے ہیں:۔

"آب حیات وہ کتاب ہے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے یہ کتاب اُستاد رحمۃ اللہ علیہ سے درساً درساً پڑھی ہے، تب مصنف کے مدارک پر مطلع ہوا ہوں، میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس واقعہ کا حوالہ دیکر عرض کیا تھا کہ مجھے یہ کتاب آپ پڑھادیں، تو انہوں نے بایں ذہن و ذکاء فرمایا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں، تو ایسی کتاب ہم جیسے نالائقوں کے بس کی بات کیا ہو سکتی ہے اور پھر اس کا بھی ایک ٹکڑا جس کا سیاق و سباق بھی سامنے نہ ہو، اور سامنے کرنے کی فرصت بھی نہ ہو تو جناب خیال فرمائیں کہ ہم جیسوں سے اس میں کیا بن پڑے گا، تاہم ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ —

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ایک مستقل نظریہ ہو اور عین مطابق کتاب و سنت ہے کہ اولاً و حقیقتاً مخلوقات میں مومن آپ ہیں، اور آپ کے پرتووں سے دوسرے لوگ اس طرح مومن ہیں جیسے آفتاب بالاصل منور ہے اور در و دیوار اس کے دھوپ پڑجانے سے منور کہلانے لگتے ہیں۔

پس حقیقتاً در و دیوار منور نہیں ہوتے بلکہ دھوپ اور سورج منور ہوتے ہیں ان کے لگ جانے سے یہ بھی منور کہلانے لگتے ہیں۔ پس اصل میں مومن حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کے نامزد ہو کر جس کا حاصل انقیاد کلی ہے امتی کو بھی مومن کہا جانے لگتا ہے۔ پس جس طرح

دھوپوں کے ٹکڑوں کی اس کے سوا کوئی تعریف اور حدِ تام کچھ نہیں کہ وہ آفتاب کا ایک اثر ہے۔ اسی طرح مومن کی اس کے سوا کوئی تعریف نہیں کہ وہ پیرو نبوی ہے اور اسکی رُوح وہاں سے کوئی حصّہ پائے ہوئے ہے۔

اس کا قدرتی اثر یہ ہے کہ دُھوپ کو آفتاب کا نُورانی سایہ کہا جائے جدھر اس کا رُخ ہوگا اُدھر ہی دُھوپ کی نقل و حرکت ہوگی، وہ ٹھیر جائے گا یہ بھی ٹھیر جائے گی، وہ لوٹ جائے گا، یہ بھی لوٹ جائے گی۔ اسی طرح مومن بحیثیت مومن حضور کا ایمانی سایہ ہے، جدھر کو آپکے عقیدے وعمل کا رُخ ہوگا اُدھر ہی کو اس کا بھی رخ ہوگا۔ پس مومن کی ایمانی نقل و حرکت تابع ہے حضور کی ایمانی نقل و حرکت، اسی کو ادھر سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر دُھوپ حرکت کر رہی ہے تو یہ دلیل ہوگی کہ آفتاب ضرور حرکت میں ہے، گویا پہلے وہ حرکت میں آیا تب یہ حرکت میں آئی۔ گویا آفتاب متوجہ ہوا تو دھوپ میں نقل و حرکت پیدا ہوگئی۔ لیکن اس خاص قطعہ دھوپ کی طرف آفتاب کے توجہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اب وہ دوسری دھوپوں کی طرف متوجہ نہیں رہا، ہمہ تن اسی دھوپ کا ہوگیا، بلکہ اسے بھی حرکت میں لا رہا ہے اور دوسرے قطعہ ہائے دھوپ بھی اپنی اپنی جگہ اپنے ظرف میں اس کی حرکت سے متحرک ہیں۔ پس بظاہر تو دُھوپ آفتاب کی طرف متوجہ ہے اور بحقیقت آفتاب دُھوپ کی طرف متوجہ ہے۔ اسی طرح بظاہر تو اُمتی درود وسلام پڑھ کر حضور کی طرف متوجہ ہے مگر بحقیقت پہلی توجہ حضور کی ہے جس سے اس کے قلب کا رُخ حضور کی طرف ہوگیا ہے اور جیسے آفتاب ایک قطعہ کی طرف توجہ کرکے ہمہ تن اس ایک قطعہ میں مستغرق نہیں ہو جاتا ایسے ہی حضور بھی کسی ایک دو، دس بیس اُمتیوں کی طرف یہ توجہ خاص فرما کر دوسرے اُمتیوں سے بے رُخ نہیں ہوتے، اور استغراق کلی فرد واحد کی طرف نہیں ہوتا جسکو دوسرے افراد سے زوالِ استغراق سے تعبیر کیا جائے، کیونکہ شعب بے انتہا ہیں جن کی طرف توجہ ہے۔ اسی سے یہ واضح ہوا کہ اگر استغراق ہوسکتا ہے تو پوری اُمت کی طرف ہوسکتا ہے نہ کہ ابعاض کی طرف، لہٰذا استغراق بھی ثابت مگر لجمیع الامۃ اور عدم استغراق بھی مگر لابعاض الامت۔

پھر یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آفتاب اگر ساری دُھوپوں طرف متوجہ ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے نفس اور مالک النور کی طرف متوجہ نہیں، اگر اس کا رُخ خود اس کی ہی اصل کی طرف نہ ہو تو یہ نور ہی اس میں کہاں سے آئے؟ اس لئے وہ اپنے اصل منبع النور یعنی ذات خداوندی کی طرف بلاشبہ رُخ کئے ہوئے ہے، اس منبع النور کی طرف سے اس کا رُخ دھوپوں کی طرف کل کی طرف اور بعض کی طرف کردیا ہے کہ یکو بینا وہ اوپر سے نور لیتا ہے اور نیچے کو دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح حضور پُر نور اگر تمام اُمت یا ابعاض امت کی طرف متوجہ ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ اپنے نفس کریمہ اور اپنے اصل حقیقی یعنی رب العزت کی طرف متوجہ ہیں۔ نہیں بلکہ اُدھر متوجہ ہو کر نُور لیتے ہیں، حاصل شُدہ نور کا ذخیرہ اپنے نفس کریمہ میں جمع فرماتے ہیں اور پھر اس مخزنِ نُور سے توجہ اُمت کی طرف فرماتے ہیں تو اُمتی بھی بطور ردِ عمل حضور کی طرف متوجہ ہو کر جس کی صورت صلوٰۃ وسلام ہے نُور حاصل کرتے ہیں۔ اسی منجانب اللہ رُوح کا اپنے نفس کریمہ کی طرف پھیرنا۔ ردّ اللہ علی روحی سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اور پھر نفس کریمہ کو امتی کی طرف متوجہ کرنے کو حتی اسلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس ردِّ روح کا مطلب نفخِ روح نہیں بلکہ اقبال و توجہ ہے! اسلئے یہ حدیث درحقیقت شرح ہے اس نظریہ کی جو آبِ حیات کی عبارت میں مرقوم ہے، اور اس عبارتِ قاسم العلوم کی شرح اپنے فکرِ ناقص سے وہ ہے جو عرض کی گئی۔" واللہ اعلم +

حاصل یہ ہوا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر آن مشاہدہ جمالِ الٰہی میں بھی مستغرق رہتے ہیں اور اُمت کی طرف بھی آپکی توجہ ہر لحظہ مبذول رہتی ہے، نہ یہ استغراق "توجہ" میں مانع ہوتا ہے نہ توجہ "استغراق" میں، یہی وجہ ہے کہ جب امت کا ایک عارفِ کامل حالتِ کشف میں اپنے محبوب کے جمالِ جہاں آرا کے دیدار سے مشرف ہوا تو اس نے سرورِ عالم کو اس حال میں پایا:-

"ورأیتہ مستقرا علی حالۃ واحدۃ متوجہا الی الخلق لابسا لباس العظمۃ فاذا توجہ الیہ انسان بجہد ہمتہ ولا ارید الانسان العالی الہمۃ فقط بل کل ذی کبد یشتاق الی شیئ و یتوجہ الیہ بقصدہ وشوق فانہ یتدلی الیہ رأیتہ صلی اللہ علیہ وسلم نیشرح انشراحا عظیما لمن صلی علیہ وحیّاہ"

"میں نے سرورِ عالم کو اس حال میں دیکھا کہ آپ بندگانِ الٰہی کی طرف متوجہ تھے، پوری توجہ کیساتھ عظمت و بڑائی کا لباس آپکے زیبِ تن تھا۔ جب کوئی خدا کا بندہ ذوق و شوق کیساتھ آپکی طرف متوجہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ سرورِ عالم اُس سے قریب ہوگئے اور میں نے دیکھا کہ جس شخص نے حضور پر درود وسلام بھیجا اور آپکی تعریف کی تو آپ اُس سے بہت زیادہ خوش ہوئے"

حیاتِ اخروی
کے چند مختلف مظاہر

از

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی رحمہ اللہ

پس منظر: تحریر نگار کے پچھلے مضمون "حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" پر اٹھنے والے علمی و فکری سوالات کے تشفی بخش جواب کے طور پر اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحؒ کی اصولی رہنمائی رہنمائی و حکم کے تحت لکھا گیا ایک تفصیلی اور تحقیقی مقالہ

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

جون، جولائی 1954ء

پہلی قسط:-

حیاتِ اُخروی کے چند مختلف مظاہر

(از مولٰنا اخلاق حسین قاسمی الدھلوی، فاضل دیوبند)

"حیات النبی" کے عنوان سے میرا ایک مقالہ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ کے "دار العلوم" میں چھپا تھا، جس میں حیات النبی کے متعلق علماء متقدمین و متاخرین کی مختلف توضیحات و تفسیرات پیش کی گئی تھیں۔

اس مقالہ کی اشاعت پر ایک طرف تو یہ ہوا کہ مخدومی حضرت مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی زید مجدہم نے شائع شدہ مضمون سے پیدا ہونے والے بعض اہم سوالات کی طرف احقر کو متوجہ فرمایا، اور حکم دیا کہ اس موضوع کو ان اصولی لائنوں پر ترتیب دو تاکہ کوئی عقلی اور نقلی الجھاؤ پیدا نہ ہو۔

دوسری طرف مولٰنا سید محمد ازہر شاہ صاحب قیصر نے بعض ناظرین دار العلوم کے خطوط میرے پاس بھیجے، جن میں بعض دوستوں نے حیات اُخروی کے متعلق کچھ باتیں معلوم کیں اور کچھ اعتراضات بھی کئے۔

اس تحریک پر حیات اُخروی سے متعلق یہ مختصر مقالہ ترتیب دے کر ناظرین دار العلوم کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔"

(اخلاق حسین قاسمی الدہلوی)

قرآنِ حکیم کے نزدیک حقیقی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے دنیا کی موجودہ زندگی کو تو قرآن عارضی زندگی کہتا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف تمام آسمانی کتابوں نے انسان کو متوجہ کیا ہے

وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان (عنکبوت)	"اور پچھلا گھر جو ہے سو وہی ہے زندگی"

مادہ پرست ملحدوں سے اسی بات پر اسلام کا جھگڑا ہے وہ کہتے ہیں جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد کوئی زندگی نہیں۔

وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یھلکنا الا الدھر۔	"اور کہتے ہیں اور کچھ نہیں بس یہی ہے ہمارا جینا دنیا کا ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم جو مرتے ہیں سو زمانہ ہمیں مارتا ہے۔"

قرآنِ حکیم نے اس کے جواب میں کہا، کہ نہیں، موت کے بعد زندگی ہے، جس زندگی میں تم اپنے کئے کا پھل پاؤ گے:۔

قل اللہ یحییکم ثم یمیتکم ثم یجمعکم الیٰ یوم القیامۃ	"تو کہہ اللہ ہی جلاتا ہے تم کو پھر مارے گا تم کو پھر زندہ کر کے اکٹھا کریگا تم کو قیامت کے دن۔"

مطلب یہ کہ موت کے بعد تم فنا ہو کر حساب کتاب سے نہیں چھوٹ سکتے۔ بلکہ زندہ رہتے ہو، موت تو صرف دنیا سے منتقل ہونے کا نام ہے۔

کچھ رُوح کے متعلق

اصل مسئلہ جس سے آگے بحث کرنی ہے چونکہ عالم روحانیات سے متعلق ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے رُوح کے بارے میں چند باتیں واضح کر دی جائیں:۔

(۱)۔۔۔ انسان نام ہے کثیف مادہ (جسم) اور جوہر مجرد (رُوح) کے مجموعہ کا، یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں کہ گویا ایک ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے سے متاثر ہوتا ہے۔

(۲) :— ادراک کرنا مادہ کا کام نہیں، یہ کام جوہرِ مجرد یعنی رُوح کا ہے۔

(۳) :— رُوح عالم کثیف کی چیزوں کا عموماً حواس یعنی کان آنکھوں اور ناک وغیرہ کے ذریعہ ادراک کرتی ہے۔ لیکن عالم لطیف کی چیزوں کے ادراک میں وہ حواس کی محتاج نہیں ہے ان کا ادراک وہ خود بخود کرتی ہے۔

(۴) :— انسان مرکر نیست و نابود نہیں ہوتا، بلکہ وہ جوہر لطیف جو اس پیکرِ خاکی میں بولتا چالتا اور تکلیف و راحت محسوس کرتا ہے اپنے قالبِ خاکی سے جُدا ہوکر زندہ رہتا ہے۔

(۵) :— اس عالم مادیات میں بھی یہ قانون قدرت ہے کہ جو جسم جتنا زیادہ کثیف ہے وہ اتنا ہی کم طاقت اور جلد فنا ہونیوالا ہے اور جو جسم جتنا زیادہ لطیف ہے اس میں اتنی ہی زیادہ طاقت و پائیداری ہے۔

مو آلیدِ ثلاثہ حیوانات، نباتات و جمادات کو دیکھئے، یہ کس قدر جلد فنا ہو جاتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں بسائط اور نیرات سماوی، چاند، سُورج وغیرہ کو دیکھئے کہ ان میں بقاء کی کس قدر طاقت ہے۔

پس جب اجسام لطیفہ میں اتنی بقاء ہے تو عالم مجردات رُوحانیات میں کس قدر قوتِ بقاء ہوگی اور اس کی چیزیں کتنی دیر تک باقی رہ سکتی ہیں؟ اندازہ کر لیجئے!

(۶) :— قُدرت نے موجودات کے ہر ہر ذرّہ میں تاثیر ودیعت کی ہے۔

پس جس طرح اجسام میں تاثیر ہے اِسی طرح علوم و افعال میں بھی تاثیر ہے اور اس تاثیر سے رُوحِ لطیف متاثر ہوتی ہے۔

(۷) :— موجودہ مادی عالم میں جسم "رُوح" کے لئے ایک قسم کی قید ہے جو اس کے ادراک و احساس میں مانع ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود ادراک کا کام رُوح ہی انجام دیتی ہے۔

پس جب یہ رُوح جسم کی قید سے آزاد ہو جائے گی تو اس میں ادراک کی قوت بڑھ جائے گی اور پھر نیک و بد اعتقادات اور اعمال خیر و شر کی تاثیرات کو بدرجۂ اتم محسوس کرے گی۔ یہی حقیقت ہے برزخ یعنی قبر کے عذاب و ثواب کی۔

(۸) :— حواس انسانی کی دسترس کثیف اجسام تک ہے، لطیف اجسام کا ادراک بھی حواس کی طاقت سے باہر ہے، پھر عالم مجردات یعنی روحانیات کا ادراک حواس کیسے کر سکتے ہیں۔

(۹) :— عالم جسمانیات میں کثافت کے باعث اثر و تاثیر کی صفت بہت ضعیف ہے، لیکن باوجود اس کے صورت حال یہ ہے کہ لوہے پر جب آگ کی حرارت کا اثر پڑتا ہے تو لوہا خود آگ بن جاتا ہے۔

اِس کے مقابلہ میں مجردات میں لطافت کے باعث اثر و تاثیر کی صفت بہت قوی ہے۔

اِس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ رُوح لطیف پر جب انوارِ حق متجلی ہوتے ہیں تو اس کی لطافت، نورانیت اور طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

رُوح کے متعلق یہ چند مسلم حقیقتیں ذہن میں رکھئے، پھر آگے بڑھئے :—

آخرت کا عذاب و ثواب
عالمِ برزخ، عالمِ قرار

قبر کا عذاب اور ثواب برحق ہے۔ یہ اسلام کا مسلمہ عقیدہ ہے، اِس عقیدے کی بُنیاد اِسی حقیقت پر قائم ہے، کہ موت کے بعد مومن اور کافر دونوں کی رُوحیں زندہ رہتی ہیں۔

جسم سے ظاہری مفارقت اور ظاہری علیحدگی کے بعد رُوحِ انسانی کہاں جاتی ہے؟— جہاں جاتی ہے اس جگہ کا نام "برزخ" ہے، عالَم برزخ کیا ہے؟—

موت کے بعد جو زندگی شروع ہوتی ہے اُسے قرآن پچھلی زندگی (حیاتِ آخرۃ) اور پچھلا گھر (دار آخرۃ) کہتا ہے۔

پچھلی زندگی کے دو حصے ہیں :—

(۱) شخصی موت سے لے کر اجتماعی موت تک کا درمیانی وقفہ، اسے عالم برزخ کہتے ہیں۔

(۲) پورے جہاں کی اجتماعی موت اور پھر حشر و نشر سے لیکر ابد تک اسے عالمِ قرار کہتے ہیں۔

یہ وضاحت تو رُوح کی جائے قیام کے بارے میں تھی۔

اب رہا یہ سوال کہ جسم رُوح سے ظاہری بے تعلقی کے بعد کہاں جاتا ہے؟ تو یہ ظاہر ہے کہ اسے قبر کے حوالہ کیا جاتا ہے لیکن قبر سے مراد صرف زمین کا گڑھا نہیں ہے بلکہ ہر وہ مقام ہے جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی جگہ حاصل کرتا ہے۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے چار گھر بیان کئے ہیں، جن میں سے ہر گھر پہلے گھر سے بڑا اور وسیع ہے فرماتے ہیں:۔

(۱) پہلا گھر ماں کا پیٹ ہے، یہ گھر نہایت تنگ اور تاریک ہے

(۲) دوسرا گھر دُنیائے عمل و کسب ہے، جس میں انسان ماں کے پیٹ سے نکل کر موت تک رہتا ہے اور خیر و شر کماتا ہے یہ گھر پہلے گھر سے بڑا اور وسیع ہے۔

(۳) تیسرا گھر عالمِ برزخ ہے، یہ گھر دُنیا سے اتنا ہی بڑا ہے، جتنی دُنیا ماں کے پیٹ سے بڑی ہے۔

(۴) چوتھا گھر عالمِ قرار ہے، وہ جنت ہے یا دوزخ، یہ وہ آخری گھر ہے جہاں خدا تعالےٰ انسان کو منزل بہ منزل پہنچاتا ہے، اور جگہ عطا فرماتا ہے جس کا انسان فی الواقع اہل ہوتا ہے[1]

موت کے بعد جسم اور رُوح کا تعلق

اوپر کہا گیا ہے کہ "موت" رُوح اور جسم کی ظاہری مفارقت کا نام ہے "ظاہری" اس لئے کہا گیا ہے کہ سلف امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موت کے بعد رُوح کا اپنے قالب کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے، قالب یعنی جسم کسی حالت میں بھی ہو۔

ابن قیم لکھتے ہیں:۔

سلف کا مذہب ہے کہ موت کے بعد انسان کو جو راحت یا اذیت پہونچتی ہے وہ رُوح اور جسم دونوں کو پہونچتی ہے۔

صورت اس کی یہ ہے کہ رُوح تو براہ راست ثواب، یا عذاب میں مبتلا ہوتی ہے اور جسم رُوح کے واسطہ سے متاثر ہوتا ہے، البتہ جب قیامت قائم ہوگی تو پھر ارواح کو جسموں میں لوٹا دیا جائے گا، اور جسم اپنی اپنی جگہوں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

حاصل یہ نکلا کہ مومن ہو یا منکر سب کی رُوحوں کا اپنے جسموں کے ساتھ (وہ جسم کسی شکل میں بھی ہوں) تعلق و رابطہ رہتا ہے اور اسی رابطہ کی وجہ سے وہ جسم "رُوح" پر طاری ہونے والے عذاب و ثواب کا مزہ چکھتا ہے۔

دُنیا، برزخ اور قیامت تینوں عالموں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ

(۱) عالمِ دُنیا میں جسم نمایاں ہے اور رُوح پوشیدہ، اس لئے راحت و اذیت کی کیفیات براہ راست جسم پر طاری ہوتی ہیں اور بالواسطہ رُوح پر۔

(۲) عالمِ برزخ میں رُوح نمایاں ہوتی ہے اور جسم پوشیدہ اس لئے وہاں رُوح پر بالذات راحت و اذیت طاری ہوتی ہے اور جسم پر بالواسطہ

(۳) عالمِ قیامت میں رُوح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے۔ اس لئے وہاں دونوں براہ راست مبتلائے عذاب و ثواب ہوں گے۔

اس موقعہ پر ایک اور شبہ ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے الفاظ میں اس کا جواب ملاحظہ کیجئے:۔

اگر کوئی شُبہ کرے کہ ہم مدت تک مُردہ کو قبر میں پڑا ہوا دیکھتے ہیں اور اس پر نظر رکھتے ہیں، لیکن نہ ہمیں عذاب نظر آتا ہے نہ ثواب، پس جو بات اپنے مشاہدہ کے خلاف ہو اس کا کیسے یقین کیا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قبر میں پڑے ہوئے مُردہ پر عذاب اور ثواب برحق ہے۔ لیکن ہماری آنکھ ملکوتی اُمور کے مشاہدہ سے قاصر ہے۔

صحابہ کرام کو دیکھو، انھیں وحی کے آنے اور جبریل کے اُترنے کا یقین تھا، حالانکہ انہوں نے کبھی جبریل اور وحی کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، پس اگر کسی کو اس پر شبہ ہے، تو وہ پہلے فرشتوں

[1] کتاب الروح ص ۱۸۵ ۔ [2] ایضاً ص ۷۲

اور وحی پر اپنے ایمان کو پختہ کرے، اس کا تو اصل ایمان ہی کمزور ہے۔

ہاں! اگر کوئی مثال سے قبر کے عذاب و ثواب کو سمجھنا چاہے تو اُسے سونے والے پر غور کرنا چاہئے۔

سونے والے کو اچھے اچھے خوابوں سے راحت پہنچتی ہے اور بُرے اور خوفناک خوابوں سے تکلیف۔

وہ اچھے اچھے کھانے کھاتا ہے، باغوں کی سیر کرتا ہے، اِس سے اُس کو راحت و خوشی محسوس ہوتی ہے۔

سانپ، بچھو اُسے کاٹتے ہیں، کوئی مارتا ہے، اس سے اُسے تکلیف محسوس ہوتی ہے، حالانکہ ہم اُس کے پاس بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا، خواب دیکھنے والا بعض اوقات چونک پڑتا ہے، چلا اُٹھتا ہے، پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے، وہ تو اتنا محسوس کرتا ہے مگر ہمیں نہ کچھ نظر آتا ہے اور نہ کچھ احساس ہوتا ہے۔

پس اگر اس سونے والے پر طاری ہونے والی کیفیات کا ہم انکار نہیں کر سکتے۔ تو پھر برزخ کے رُوحانی عالم میں پیش آنے واقعات کا کیسے انکار کر سکتے ہیں[1]۔

اِس مسئلہ میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جس طرح انبیاء علیہم السّلام کو ادراک و احساس کی وہ قوت عطا فرمائی جس سے وہ عالم روحانیات کی چیزوں کو دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، فرشتوں کو دیکھتے تھے، مُردے پر نازل ہونے والے عذاب و ثواب کو دیکھتے تھے، تو وہ اسی طرح اپنے عام بندوں کو بھی وہ قوت ادراک عطا فرما سکتا تھا، آخر انہیں کیوں محروم کر دیا؟۔

علامہ ابن قیم اس کا جواب دیتے ہیں:۔

اگر ایسا ہو جاتا تو ایمان و اقرار کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا اصل ایمان تو وہی ہو جو بن دیکھے حقائق پر لایا جائے۔

یہ عالم "دارالامتحان" ہے، دارالجزاء نہیں ہے، امتحان و آزمائش کے عالم میں عالم جزاء سے پردہ ہٹا دیا جاتا تو امتحان و آزمائش کی بات ہی کیا رہ جاتی[2]۔

ایک سوال یہ بھی قابل غور ہے کہ جب ایک جسم خاکی آگ میں جل جلا کر خاک میں مل جاتا ہے اور اس کی خاک کے ذرّے اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں، تو پھر اسے عذاب و ثواب کیسے پہنچتا ہے؟۔

اِس کا جواب بھی علامہ ابن قیم سے سُنیئے!

جسم خاکی کے متفرق اجزاء کے ساتھ رُوح کا اتصال و تعلق کیا مشکل ہے، اور اس تعلق کی وجہ سے ان اجزاء میں اذیت و لذت کا شعور کیا بعید ہے۔

کیا جمادات میں ادراک و شعور کا ہونا (خاص کر موجودہ سائنٹیفک دور میں) ایک مسلم حقیقت نہیں ہے؟۔

پس جب ان اجسام (جمادات) میں ادراک ثابت ہے جن کے ساتھ رُوح انسانی کا کبھی تعلق نہیں رہا، تو ان اجسام میں احساس و ادراک بدرجہ اولی موجود ہونا چاہئے جن میں رُوح انسانی مدت تک ساری رہی ہو اور مفارقت کے بعد بھی تعلق باقی ہو[3]۔

برزخ کے عذاب و ثواب پر چند نصوص

جسم سے مفارقت کے بعد رُوح زندہ رہتی ہے، مومن کی رُوح ہو یا کافر کی، اور ہر رُوح کا تعلق اپنے جسم خاکی کے ساتھ قایم رہتا ہے۔

اس پر چند نصوص ملاحظہ ہوں:۔

(۱) ما من مسلم يمر على قبر اخيه، كان يعرفه في الدنيا فيسلم عليه الا رد الله عليه روحه حتى يرد عليه السلام۔

"جب کوئی مُسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی قبر پر جاتا ہے جسے وہ دُنیا میں جانتا تھا اور جا کر اُسکو سلام کرتا ہے تو خدا تعالےٰ صاحب قبر کی رُوح کو اس پر لوٹا دیتا ہے اور پھر وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے"

(۲) سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مقتولین بدر کی لاشوں پر کھڑے ہوئے

[1] حجۃ اللہ البالغہ، باب عالم مثال۔

[2] روح ص۱۱۳ و ص۱۱۴، [3] کتاب الروح ص۱۱۵۔

جو کنوئیں کے اندر بھر دی گئی تھیں، اور ایک ایک لاش کا نام لے کر فرمایا:۔ "کیا اب بھی تمہیں معلوم ہوا یا نہیں، کہ خدا تعالےٰ کا وعدہ سچا ہے، میں نے تو اللہ کے وعدے کی سچائی کو دیکھ لیا"۔

حضرت عمرؓ نے لاشوں کو مخاطب کرنے پر تعجب کا اظہار کیا اور حضورؐ سے سوال کیا، آپ نے فرمایا:۔

والذی بعثنی بالحق ما انتم باسمع لما اقول منھم ولکنھم
"قسم ہے اُس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا، تم میری بات کو ان مُردوں سے زیادہ نہیں سُنتے لیکن یہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے"

یعنی جتنا تم سُنتے ہو اتنا ہی یہ سُنتے ہیں

حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔

"مُردہ ان لوگوں کے جوتوں کی آواز بھی سُنتا ہے جو مُردہ کو دفن کر کے لوٹتے ہیں"۔

قبروں پر جانے والوں کے لئے یہ مسنون قرار دیا گیا کہ وہ "السلام علیکم یا دار قوم مومنین" کہا کریں۔

ارشاد فرمایا:۔

"جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی قبر پر جاتا ہے، اور وہاں جا کر بیٹھتا ہے تو صاحب قبر کو اس سے راحت محسوس ہوتی ہے"۔

حضرت عمرو ابن العاصؓ نے آخر وقت میں اپنی اولاد کو وصیت فرمائی:۔

"مجھے دفن کرنے کے بعد میری قبر پر اتنی دیر ٹھیرنا جتنی دیر میں اونٹ کو ذبح کیا جاتا ہے اور اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ تمہارے ٹھیرنے سے مجھے طمانینت و راحت محسوس ہو"

سرورِ عالم کا دو قبروں پر گذرنا اور یہ فرمانا کہ ان میں سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے احتیاط نہیں کرتا تھا، اور دوسرا چغل خور تھا"۔ مشہور واقعہ ہے۔

علامہ ابن قیم کتاب الروح میں اس باب کی احادیث، آثار صحابہ و تابعین نقل کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"سلف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مُردہ قبر پر آنے والے کو پہچانتا ہے اور اُس سے اسے خوشی ہوتی ہے"۔

آگے لکھتے ہیں:۔ یہ سلام، نداء اور خطاب اسی چیز کے لئے ہوتا ہے جو موجود ہوتی ہے، سُنتی ہے اور سمجھتی ہے۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔ رُوحیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ مبتلائے عذاب رُوحیں:۔ یہ تکلیف و اذیت میں گرفتار ہوتی ہیں اس لئے انہیں آپس میں ملنے کی آزادی نصیب نہیں ہوتی۔ مرحوم روحیں:۔ یہ آزاد ہوتی ہیں، آپس میں ملتی جُلتی ہیں دُنیا اور اہلِ دُنیا کا ذکرِ خیر کرتی ہیں۔

نیک رُوحوں کی ملاقات اور رفاقت قرآن سے ثابت ہے۔ فاولٰئک مع الذین انعم اور:۔ وحسن اولٰئک رفیقاً۔

اِس باب کی ایک حدیث بھی مُلاحظہ ہو:۔

ابو ایوب انصاریؓ روایت فرماتے ہیں، حضورؐ نے ارشاد فرمایا "ایک مسلمان کی جب وفات ہوتی ہے تو رحمت کے فرشتے اس کے عزیزوں سے کہتے ہیں، جاؤ! اپنے بھائی کو دیکھو تاکہ اسکی وحشت دور ہو پھر اس کے عزیز اس سے دُنیا والوں کا حال پوچھتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ ایک شخص کے متعلق پوچھتے ہیں تو وہ جواب دیتا ہے کہ اس کی تو وفات ہو چکی، اس کے عزیز کہتے ہیں:۔ انا للہ وانا الیہ راجعون وہ جہنم میں ڈال دیا گیا، بُری ہے وہ جگہ"۔

برزخ اور رُوحوں کے متعلق مختلف حالات کی تفصیل دیکھنے کے لئے علامہ سیوطی کی شرح الصدور، امام قرطبی کے تذکرہ اور ابن قیمؒ کی کتاب الروح کی طرف رُجوع کرنا چاہیئے۔

اِس تمہیدی وضاحت کے بعد یہ امر بالکل صاف ہو گیا کہ موت کے بعد زندگی کی جو نوعیت ہے، (قطع نظر عذاب و ثواب کے) اسکے لحاظ سے سب زندہ ہیں، کافر بھی، مومن بھی۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب زندگی کی اس نوعیت میں سب برابر ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں صرف انبیاء علیہم السلام اور شہیدوں کو زندہ کہا گیا ہے اور انہیں مُردہ کہنے کی ممانعت آئی ہے، آئیے قرآن حکیم سے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش...

قسط نمبر ۲ :-

حیاتِ اُخروی کے مختلف مظاہر

(مولانا اخلاق حسین قاسمی الدھلوی فاضل دیوبند)

قرآنِ حکیم اور حیات

قرآن حکیم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن موجودہ زندگی میں بھی اُسی شخص کو زندہ کہتا ہے جو زندگی کے اصل مقصد کو پُورا کرتا ہے، وہ لوگ قرآن کی زبان میں مُردہ ہیں جو زندگی کے حقیقی مقصد سے غافل ہیں۔

انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مختصر لفظوں میں یوں سمجھیے کہ وہ مقصد ہے —— عبادتِ خالق اور خدمتِ خلق۔

اس سلسلہ کی چند آیات ملاحظہ ہوں :-

(۱) یاایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم۔ (انفال)

"اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور رسول کا جس وقت بلاوے تمکو ایک کام پر جسمیں تمہاری زندگی ہے۔"

یہ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمۃ کا ہے، شاہ صاحب نے (لما) کے لام کو الیٰ کے معنی میں لیا ہے

وہ چیز کیا ہے جس کی طرف رسول اللہ بُلاتے ہیں؟ -

قتادہ فرماتے ہیں :- وہ قرآن حکیم ہے، اس میں نجاۃ ہے، بقاء ہے، زندگی ہے۔

سدی کہتے ہیں :- کفر نے ان کو مُردہ کردیا تھا اسلام اُن کو زندہ کرنے آیا۔

حضرت امام ولی اللہ الدہلوی رح نے اپنے فارسی ترجمہ میں قرآن کی مراد واضح کردی، فرماتے ہیں :-

برائے آنکہ زندہ دل سازد شمارا۔

"اسواسطے کہ تمہیں زندہ دل بنادے۔"

(۲) وما یستوی الاحیاء ولا الاموات۔ (فاطر)

اور برابر نہیں جیتے نہ مردے

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :- زندوں سے مراد مومنین، اور مُردوں سے مراد کفار ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے یہ مثال بیان فرمائی ہے۔

(۳) اومن کان میتاً فاحییناہ وجعلنا لہٗ نوراً یمشی بہ فی الناس۔ (انعام)

"بھلا ایک شخص کہ مُردہ تھا پھر ہمنے اسکو زندہ کیا اور دی اسکو روشنی کہ لئے پھرتا ہو لوگوں میں"

یہ اُس شخص کی حالت بیان فرمائی ہے جو پہلے مُردہ تھا پھر اللہ تعالےٰ نے اُسے ایمان کی توفیق دیکر زندہ کردیا (ابن کثیر)

(۴) اسی مناسبت سے اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم کو "رُوح" فرمایا ہے

وکذالک اوحینا الیک روحاً من امرنا (شوریٰ)

"اور اسی طرح بھیجا ہمنے تیری طرف قرآن اپنے کلام میں سے۔"

ہم نے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا ترجمہ اختیار کیا ہے جو عام مفسرین کی رائے کے مطابق ہے۔

ابن قیم کہتے ہیں :- وحی کو رُوح اس لئے کہا گیا کہ وحی سے دلوں کو زندگی ملتی ہے، ارواح کو حیات نصیب ہوتی ہے۔

(۵) من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مومن

جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت ہو اور وہ یقین پر ہو

فلنحیینہ حیوٰۃ طیبۃ۔ (نحل) — تو اس کو ہم جلد دیں گے ایک اچھی زندگی"

نیک عملی ہی کی بدولت ستھری زندگی نصیب ہوتی ہے، اور وہی زندگی صحیح معنی میں زندگی کہلانے کی مستحق ہے۔

جو زندگی ستھری اور پاکیزہ نہ ہو وہ حیوان کی زندگی تو ہو سکتی ہے انسان کی زندگی نہیں ہو سکتی۔

حسن، مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں:- کامل درجہ کی پاکیزہ زندگی صرف جنت ہی میں عطا ہوگی۔ اور یہ اُسی کو ملے گی جو دنیا میں اپنی زندگی کو پاکیزہ رکھے گا۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:-

"من کانت حیاتہ بنفسہ یکون مماتہ بذھاب روحہ و من کانت حیاتہ بربہ فانہ ینتقل من حیاۃ الطبع الی حیاۃ الاصل وھی الحیٰوۃ الحقیقیۃ" (روح البیان ج ۴ ص ۱۳۵)

"مطلب یہ ہے کہ جس کی زندگی اپنے نفس سے ہے تو اس کی موت تو صرف روح نکل جانے سے ہی واقع ہو جاتی ہے، اور جس کی زندگی اپنے رب سے ہے تو وہ طبعی حیات سے اصلی حیات کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، جو حیات حقیقیہ ہے"

اب آخرۃ کے پچھلے گھر کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر معلوم کیجئے
مجرمین کے متعلق فرمایا۔

انہ من یات ربہ مجرما فان لہ جھنم لا یموت فیھا ولا یحیٰی۔ (طٰہٰ) — "بات یہی ہے کہ جو کوئی آیا اپنے رب کے پاس گناہ لیکر سو اس کے واسطے دوزخ ہے نہ مرے اس میں نہ جیے"

الذی یصلی النار الکبریٰ ثم لا یموت فیھا ولا یحیٰی۔ (اعلیٰ) — "وہ جو داخل ہوگا بڑی آگ میں پھر نہ مریگا اسمیں نہ جیے گا"

شہداء کے متعلق فرمایا:-

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات، بل احیاء عند ربھم۔ — "جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے رب کے پاس"

اِن آیتوں کو سامنے رکھکر ہر شخص آسانی کے ساتھ اس بات کو سمجھ سکتا ہے:-

(۱) قرآن اُس شخص کو زندہ سمجھتا ہے جو روحانی اور اخلاقی تقاضوں کو پورا کرکے اپنے جوہر انسانیت کو زندہ رکھتا ہے۔

(۲) وہ شخص قرآن حکیم کے نزدیک مُردہ ہے جو نفسانی اور حیوانی خواہشات کے پیچھے پڑکر اپنی اخلاقی حس اور روحانی صلاحیت کو برباد کر دیتا ہے۔

پچھلے گھر کی زندگی چونکہ اسی پہلے گھر کی زندگی کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے قرآن وہاں کے رہنے والوں میں بھی اُن ہی کو زندہ کہکر یاد کرتا ہے جو اپنی روحانیت کو صحیح سلامت بچاکر لیجاتے ہیں اور اُنہیں مُردوں میں شمار کرتا ہے جو ایک بے جان اور تاریک روح کے ساتھ اس عالم کو چھوڑتے ہیں۔

قرآن حکیم قانون و احکام کی بحثوں میں تو موت و حیات کے الفاظ کو بلا شبہ طبعی مفہوم میں استعمال کرتا ہے لیکن اس کے علاوہ جب وہ ہدایت اور سعادت کی حقیقتوں پر روشنی ڈالتا ہے تو اس وقت موت و حیات کا وہی مفہوم مراد لیتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔

اصل مسئلہ حیات النبی

قرآن حکیم نے صرف شہداء کے متعلق تصریح کی ہے کہ وہ زندہ ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے علاوہ اور کوئی اس عزت سے سرفراز نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب شہداء زندہ ہیں تو انبیاء اور صدیقین بدرجۂ اولیٰ زندہ ہیں کیونکہ قرآن حکیم نے نعمت پانے والے بندوں کی حسب ذیل ترتیب قائم کی ہے:-

"من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین"

اسی ترتیب سے یہ حضرات، آخرۃ میں حیاۃ حقیقی کی دولت پاتے ہیں۔

مقام انبیاء - اعلیٰ علیین

انبیاء علیہم السلام حیات میں حیات کے سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام پر فائز ہیں خصوصاً

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے متعلق "حیات النبی" پوری اُمت کا متفقہ عقیدہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے صرف حضور کے لئے "حیات النبی" کی صفت مشہور و مسلّم ہے؟ خصوصیت مُلاحظہ کیجئے:۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدمتِ خلق اور عبادتِ خالق دونوں منصبوں میں سب سے بلند درجہ حاصل تھا۔ ہر لمحہ بندگانِ الٰہی کی ہدایت اور فلاح کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول رہتی تھی اور حق کی طرف بھی۔

خلق کی طرف توجہ فرمانے سے حق کی توجہ کم نہیں ہوتی تھی، اور حق کی توجہ ادھر کی توجہ کو کمزور نہیں کرتی تھی۔

آپ کے دل میں خلق کی ہدایت کے لئے جو لگن تھی اُس کا حال یہ تھا کہ خود حق تعالےٰ کو اظہارِ ہمدردی کے طور پر یہ کہنا پڑا تھا

فلعلك باخع نفسك علیٰ آثارهم ان لم یؤمنوا بهٰذا الحدیث اسفًا۔ (کہف) "سو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اِس بات پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دیدیں گے"

توجہ الی الخلق کا کمال ہے جو قرآن نے یہ فرمایا کہ:۔

عزیز علیه ما عنتم۔ (توبہ) "بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے"

توجہ الی الحق میں جو آپ کا درجہ تھا اس کا اندازہ اِس سے لگائیے کہ معبودِ حقیقی نے آپ کو جب پُکارا "عبد" یعنی بندہ کامل کہہ کر پُکارا، اور اسی کو آپ کی صفتِ خاص قرار دیا۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ حق کی توجہ اپنے بندے پر اس درجہ مرکوز رہنے لگی کہ قرآن نے اعلان کیا کہ اے نبیؐ! آپ بیٹھے اُٹھتے ہر حال میں، ہر وقت ہماری نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔

الذی یراك حین تقوم و تقلبك فی الساجدین (شعرا) "جو دیکھتا ہے تجھ کو جب تو اُٹھتا ہے اور تیرے پھرنے کو نمازیوں میں"

وہ دیکھتے سب کو ہیں، لیکن اس اعلان میں اپنی خصوصی توجہ کا اظہار فرمایا ہے۔

ہر لمحہ خلق کی طرف بھی کامل توجہ اور حق کی بھی پوری لگن۔

اِسی کا نتیجہ تھا کہ حضور ہر کام میں، ہر فعل میں، کھانے میں، پینے میں، یہاں تک کہ بیوی کے ساتھ تعلق میں بھی صرف حق کی خوشنودی کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔

انبیاء علیہم السلام ہی خلق کی طرف کامل توجہ کیوں فرماتے ہیں اور یہ مقام کسی دوسرے داعیٔ حق کو کیوں حاصل نہیں ہوتا؟ اِس کی وجہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تصوّف کی زبان میں سُنیئے!:۔

فرماتے ہیں:۔

حضرات انبیاء کی توجہ خلق کی طرف کامل طور پر اس لئے مبذول ہوتی ہے:۔

"کہ اُن کا خلق کی طرف نزول "عروج الی الحق" کی تمام منزلیں طے کرنے کے بعد ہوتا ہے، بخلاف ولی کے، ولی چونکہ عروج کی تمام منزلیں طے کئے بغیر نزول کرتا ہے اِس لئے ہر وقت اُوپر کی نگرانی کا فکر لگا رہتا ہے اور یہ فکر خلق کی ہدایت کی طرف کامل توجہ کرنے میں مانع ہوتا ہے"

(مکتوب ۲۶۰ دفتر اوّل)

توجہ الی الخلق کے ساتھ ساتھ توجہ الی الحق کے کمال کا ایک منظر اس موقعہ پر سامنے رہے تو بہتر ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر اور عبید اللہ ابن عمیر حضرت عائشہ صدیقہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ام المومنین بولیں "عبید اللہ کہاں تھے؟ تم نے آنا کم کیوں کر دیا؟" عبید اللہ نے عرض کیا "ام المومنین! کسی نے کہا ہے:۔ "زر غبا تزدد حبا" کبھی کبھی ملنا چاہیئے، تاکہ محبت زیادہ ہو" فرمایا "میں تو اسی کو پسند کرتی ہوں کہ تم روزانہ میرے پاس آیا کرو" یہ گفتگو چل رہی تھی کہ عبداللہ نے بات کاٹ کر کہا، "ام المومنین! چھوڑیئے اِس مذاق کو اب ہماری سُنئے، آج آپ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی عجیب واقعہ سُنائیے، ہم اسی لئے حاضر ہوئے ہیں"

حضرت صدیقہ یہ سُنکر رونے لگیں، فرمایا' ان کی زندگی کا تو ہر واقعہ عجیب ہے، کیا کیا سُناؤں، اچھا، ایک رات کا قصہ سنو! :-

"ایک روز میری باری کے دن آپ گھر تشریف لائے' باتیں چیتیں کیں پھر لیٹ گئے، بستر پر ہم دونوں ایک دوسری سے اتنے قریب تھے کہ حضورؐ کا جسم مطہر میرے جسم سے لگ رہا تھا۔

لیٹے لیٹے آپ نے فرمایا' عائشہ! مجھے اجازت دو کہ میں کچھ دیر اللہ کا ذکر کروں' میں نے عرض کیا حضور! میں اجازت دوں؟ توبہ توبہ آپ کی مرضی میں میری مرضی' ضرور اللہ کا ذکر کیجئے۔

آپ کھڑے ہو گئے' قرآن کی تلاوت کرتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے' بیٹھ کر بھی روئے' پھر لیٹ گئے سیدھی کروٹ پر' رُخسار کے نیچے ہاتھ رکھ لیا' آپ کے آنسو بہہ رہے تھے" (ابن کثیر آلِ عمران)

آپ سمجھے کہ اس واقعہ کو حضرت صدیقہ نے سب سے زیادہ عجیب کیوں سمجھا؟ واقعہ کا عجیب پہلو یہ ہے کہ ایک شوہر اپنی جوان العمر چہیتی بیوی کے ساتھ بستر پر لیٹ جاتا ہے' قریب سے قریب ہو جاتا ہے' یہ سفلی جذبات میں ڈوب جانے کا وقت ہوتا ہے' ایسے ماحول میں ذکر الٰہی کا تصور کیا؟ لیکن یہی وہ کمال ہے تعلق باللہ اور توجہ الی اللہ کا کہ عین اس حالت میں بھی ذکر الٰہی کا شوق بھڑک اٹھتا ہے اور بستر چھوڑ چھاڑ کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

یہی پہلو تھا اس واقعہ کا عجیب ترین۔

پس جس طرح دُنیا کی زندگی میں آپ حق کے ساتھ ساتھ خلق کی طرف بھی پوری توجہ فرماتے تھے اِسی طرح اس عالم سے پردہ فرمانے کے بعد تجلیات حق کے سب سے بلند مقام پر پہنچکر بھی خلق کی طرف توجہ فرما رہے ہیں۔ نیز ختم نبوت حضورؐ کا خصوصی منصب ہے اس منصب کا تقاضا ہی کہ قیام ہدایت کے لئے آپ کی کامل توجہ اس عالم کی طرف مبذول رہے اور جوں جوں آپ کا استغراق ربانی تجلیات کے مشاہدہ میں بڑھتا جائے ووں ووں آپ کی توجہ اِس عالم کی طرف بھی زیادہ ہوتی جائے۔

یہ آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے کہ ہر دور میں بلا کسی لالچ و طمع کے ہزاروں اللہ کے بندے خُدا کی وحدانیت کو قبول کر لیتے ہیں اور یہ بھی آپ ہی کا رُوحانی تصرف ہے کہ قومی تعصبات کے گھُپ اندھیروں میں اللہ کے بندے شعوری یا غیر شعوری طور پر حضورؐ کی پھیلائی ہوئی توحید اور اخوت و مساوات کی روشنی کے قریب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اِس کو بھی آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ کہنا چاہئے کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی حق کے متوالوں کی ایک جماعت اعلاء کلمۂ حق کے لئے قائم رہتی ہے' جو نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ کرتی ہے نہ کسی قسم کے لالچ و طمع میں آتی ہے۔

یہ جماعت ہے علماءِ حق کی ——

پس جو ہادیِ برحق دُنیا کی ظاہری آنکھوں سے پردہ فرما جانے کے بعد بھی نوعِ انسانی کی ہدایت کی طرف توجہ فرما رہے ہیں جن سے دُنیا کی رُوحانی زندگی برقرار ہے یقیناً وہی — حیات النبی۔ کہلانے کے مستحق ہیں۔

وہ زندہ ہیں کیوں کہ اُن کی توجہ سے زندگی برقرار ہے۔

وہ حیات ہیں کیوں کہ اُن کے تصرف سے حیاتِ رُوحانی کی تابانیاں باقی ہیں۔

علماء نے روشن آفتاب کی مثال سے اس حقیقت کو سمجھایا ہے اِس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں:-

(۱) ہر آن وہر لمحہ آپ کی توجہ دونوں طرف کامل ہے' حق کی طرف بھی اور خلق کی طرف بھی۔

(۲) ہدایت کا جو نُور اپنی توجہ سے آپ عالم کو عطا فرما رہے ہیں وہ آپ کا ذاتی نہیں' نُورِ حقیقی کی تجلی ہے' جو آپ کے واسطے سے عالم خلق پر برس رہی ہے۔

دیکھئے! قرآنِ حکیم نے اس کی طرف کتنا لطیف اشارہ کیا ہے:-

فبما رحمة من الله لنت لهم۔ "یعنی اے رحمت عالم! آپ کی ذات چونکہ رحمانی تجلیات کا مظہر اتم ہے اس لئے بندگانِ الٰہی آپ کے قلب مبارک میں اپنے لئے بے پناہ جذبۂ محبت و شفقت پاتے ہیں"

سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو آخرت کی زندگی میں قربِ الٰہی اور تجلی ربانی کا جو بلند مقام حاصل ہے اس کی وضاحت لفظوں کے ذریعہ جس قدر ممکن ہو سکتی ہے وہ ارباب علم و تصوف کی اصطلاحات میں اوپر بیان کی گئی۔ ورنہ وہ عالم ملکوت جسکے متعلق وحی الٰہی نے یہ فرمایا ہو:-

فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین (سجدہ) "سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا رکھی ہے ان کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک"

اُس کے بلند ترین مقامات کی حقیقت تک رسائی کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی حیات ہیں اور اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے مقاماتِ قرب و تجلی میں توجہ الی الحق اور توجہ الی الخلق میں مصروف و مشغول ہیں۔

حضورؐ نے معراج کے موقعہ پر ان ہی مقامات پر ان حضرات سے ملاقات فرمائی اور خود اپنی ہمت کے مطابق آگے بڑھتے چلے گئے۔

رہا حضرات انبیاء کے مقدس اجسام کا معاملہ تو چوں کہ حضرات انبیاء کی روحیں نہایت قوی ہوتی ہیں — اس قدر قوی کہ وہ اپنے قالبوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں اس لئے انہیں عام خاکی اجسام پر قیاس نہ کرنا چاہیئے۔

مقامِ صدیقین
مقامِ صدق

نبی کے بعد صدیق کا مقام ہے۔ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:

جسے باطنی معارف اور ظاہری شریعت کا کامل علم ہو، وہ صدّیق ہے، نبی اور صدیق کے علوم میں وحی اور الہام کا فرق ہوتا ہے۔

صدیق بھی زندہ ہیں، نبی کے بعد خلق کو ہدایت کا فیض سب سے زیادہ ان ہی سے پہنچتا ہے، ان ہی کے قلوب انوار نبوت کو براہِ راست قبول کرتے ہیں اس لئے اولیاء اللہ میں حیات کا سب سے بلند مقام انہیں ہی حاصل ہوتا ہے۔

اُن کی پاک روحوں کا مسکن "مقعد صدق" ہے:-

فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر۔ "ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس"

ام کبشہ نے حضورؐ سے ارواحِ مومنین کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں رہتی ہیں۔

آپ نے فرمایا:-

"مومنوں کی ارواح سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں، جو جنت میں کھاتے پیتے پھرتے ہیں اور اُن قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں جو عرشِ الٰہی کے نیچے معلق ہیں، وہ روحیں دعا کرتی ہیں، خداوندا! ہمارے بھائی بندوں کو ہم سے ملادے اور اپنے وعدے کو پورا فرما!"

یہ تمثیل ہے، مقصد یہ ہے کہ ارواحِ کاملین کو جنت میں سیر کرنے اور عرشِ الٰہی کے سایہ میں آنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔

حدیث میں صرف لفظ "مومنین" ہے، لیکن جو مقام بیان کیا گیا ہے چوں کہ وہ دوسرے تمام مقامات سے بلند ہے اس لئے ہم نے مومنین سے مومنین کاملین یعنی صدیقین مراد لئے ہیں

مقامِ شہداء
فردوسِ اعلیٰ

شہید فی سبیل اللہ کا درجہ تیسرا ہے، لیکن یہ فضیلت صرف ان ہی کو حاصل ہے کہ قرآن کریم نے انہیں "زندہ" کہا ہے۔

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

"اللہ کی راہ میں مارے جانے والے چند باتوں میں انبیاء علیہم السلام پر فضیلت رکھتے ہیں، یعنی

(۱) شہیدوں کو غسل کی حاجت نہیں۔

(۲) امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق:-

"یہ نماز جنازہ کے بھی محتاج نہیں"۔

(۳) قرآن میں آیا ہے، انھیں مُردہ نہ کہو، اور انبیاء کو مُردہ کہا گیا ہے

لیکن یہ جزوی فضیلت ہے، انبیاء علیہم السلام کی کلی فضیلت میں اس سے فرق نہیں پڑتا"۔ (مکتوب ۱۲۲ دفتر سوم)

احادیث شہداء کا جو رُوحانی مقام بیان کرتی ہیں قریب قریب اس میں وہی تمثیل ملتی ہے جو اُوپر مذکور ہے۔ البتہ ان میں صراحت ہے شہداء فی سبیل اللہ کی اور دوسرا ایک فرق یہ ہے کہ:-

خدا تعالیٰ شہیدوں سے پوچھتا ہے:-

"کچھ اور چاہتے ہو؟"

وہ عرض کرتے ہیں، خداوندا! سب کچھ ہے۔

جب خدا تعالیٰ ان سے برابر پوچھے جاتا ہے تو یہ کہتے ہیں "اچھا تو اے ہمارے رب! ہمیں ہمارے جسموں میں دوبارہ لوٹا دیجئے، تاکہ ہم تیری راہ میں پھر قتل ہوں"۔ لیکن چوں کہ یہ قانون الٰہی کے خلاف ہے، اس لئے منظور نہیں کیا جاتا۔

ہم نے شہداء کے رُوحانی مسکن کا نام فردوس اعلیٰ رکھا ہے کیوں کہ حضرت ام حارثہ نے جب اپنے بیٹے کی شہادت کے بعد حضورؐ سے پوچھا کہ وہ کہاں ہوں گے تو آپ نے ارشاد فرمایا تھا:

"فردوس اعلیٰ میں"۔

مقروض شہداء، بابِ جنت: قرآن و حدیث میں شہداء کا جو مقام بیان کیا گیا ہے وہ صرف ان شہیدوں کا ہے جن پر دوسرے کا حق نہ ہو جو شہید مقروض ہوتے ہیں، ان کے متعلق سُنئے:-

ایک شخص نے کہا، حضور! اگر میں خُدا کی راہ میں مارا جاؤں تو مجھے کونسی جگہ ملے گی، فرمایا، جنت ملے گی، وہ شخص جب جانے لگا تو آپ نے اُسے پھر آواز دی، فرمایا:-

البتہ اگر اس کے ذمہ قرض ہوگا تو یہ بات نہیں ہوگی، مجھسے جبریلؑ نے ابھی آکر یہ کہا ہے۔

ابن عباس کی روایت میں اسکی تفصیل ہے۔

ایسے شہداء جنت کے دروازہ پر رہتے ہیں، ایک سبز قبے میں وہیں ان کو صبح و شام جنت کی نعمتیں پہنچائی جاتی ہیں۔

مقامِ ابرار و صالحین، علیین: عام ابرار و صالحین کی رُوحوں کا جو مسکن بتایا گیا ہے وہ علیین ہے۔

اس مقام کی بھی مختلف حالتیں ہیں:

بعض مومن رُوحوں کے متعلق آتا ہے کہ جسم سے مفارقت کے بعد ملائکہ انہیں خدا کے حضور میں لے جاتے ہیں۔ وہ عرش الٰہی کے پاس خُدا کو سجدہ کرتی ہیں، سجدہ کے بعد خدا تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ میرے بندے کی رُوح کو عیش و مسرت کے باغات میں داخل کردو۔

بعض رُوحیں وہ ہوتی ہیں جنہیں ملائکہ ساتویں آسمان پر جاکر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس چھوڑ دیتے ہیں اور یہی ان کا مقام ہوتا ہے

بعض رُوحیں جن میں ایمان و عمل کی طاقت بہت کم ہوتی ہے وہ اپنے خاکی جسموں کی آرام گاہوں کے آس پاس ہی رہتی ہیں، یہیں ان کو ان کی طاقت کے مطابق تجلی ربانی پہنچتی رہتی ہے۔

بعض سات دن تک فنا ر قبر میں محبوس رہتی ہیں اور پھر انہیں ترقی اور علو نصیب ہوتا ہے۔

معذّب رُوحیں: کفار و منکرین کی رُوحوں کو پستیوں میں مقید کردیا جاتا ہے۔ اُن کے لئے قرآن و حدیث میں جو لفظ آیا ہے وہ "سجین" ہے، جس کے متعلق روایتوں میں آتا ہے کہ وہ زمین کے ساتویں طبقہ میں ہے۔

مطلب یہ ہے، کہ کفر و انکار کی فطرت میں جو ظلمت و پستی ہے اُسی کے مطابق ان کی رُوحوں کو تاریکیوں اور پستیوں میں مقید کردیا جاتا ہے۔

اُن تنگ و تاریک جیل خانوں میں ان رُوحوں پر کفر و انکار کی سزا کے ساتھ ساتھ گناہوں کی مختلف سزائیں بھی مسلط کردی جاتی ہیں۔ گناہ گار مومن رُوحیں اپنے گناہوں کی ص

ص سزا پاتی ہیں، گناہوں کی تاریکی اور بوجھ ان کے لئے رکاوٹ ثابت ہوتا ہے اور وہ فنا ر قبر میں رُکی رہتی ہیں یعنی انکو ان کے گناہوں کی سزا ملتی رہتی ہے، صدقات جاریہ جن کی وہ بُنیاد رکھ جاتے ہیں یا زندوں ع